ڈاکٹر انور سدید

عوامی حقوق کے حصول کی پہلی "تحریک کشمیر"

تاریخی پس منظر

مغلوں کے عہد حکومت میں کشمیر امن اور آشتی کا گہوارہ تھا۔ کشمیر کے ایک سابق بھارتی گورنر جگ موہن نے لکھا ہے کہ "کشمیر کے جن شہرفا نے شہنشاہ اکبر سے کشمیر کو اپنی سلطنت میں شامل کرنے کی درخواست کی تھی۔ ان کی دور اندیشی کی جتنی داد بھی دی جائے کم ہے۔" امن اور سلامتی کا یہ دور ۱۲۰ برس تک قائم رہا۔ اورنگزیب کی وفات کے بعد مغلوں پر زوال آیا تو کشمیر بھی ریشہ دوانیوں کا شکار ہو گیا۔ احمد شاہ ابدالی نے اس خطے پر اپنا تسلط قائم کر لیا۔ اس نے یہاں عبداللہ خاں عشق اکوپسی کو اپنا نائب مقرر کیا۔ اس کا مشیر ایک کشمیری کھتری سکھ جیون مل تھا، جو اگرچہ علاقے کے حالات سے عبداللہ خاں کو باخبر رکھتا اور امور سلطنت میں اس کی مدد کرتا تھا، لیکن درحقیقت وہ افغان حکمرانوں سے نجات حاصل کرنے کی سازشوں میں مصروف رہتا تھا۔

سکھ جیون مل کے مشن کو عبدالحسن ہانڈے نے تقویت پہنچائی۔ اکوپسی کشمیر میں نظم و نسق بحال کرنے کے بعد واپس افغانستان چلا گیا تو کشمیر میں افغان حکومت کی نگرانی کے لئے عبداللہ خان کابلی کو چھوڑ گیا۔ سکھ جیون مل اور عبدالحسن ہانڈے نے اس موقعہ کو غنیمت جانا اور عبداللہ خان کابلی کو قتل کرا دیا اور کشمیر پر قبضہ قائم کر کے اپنی خودمختاری کا اعلان کر دیا۔ سکھ جیون مل نے اپنے اقتدار کے استحکام کے لئے دہلی میں زوال آمادہ مغل دربار کے ساتھ رابطہ قائم کر لیا۔ لیکن ابدالیوں نے اس سازش کو برداشت نہ کیا۔ اور تین جنگوں کے بعد ایک دفعہ پھر کشمیر پر اپنا کھویا ہوا تسلط واپس لے لیا۔

اس افغانی دور میں لعل خان خٹک، فقیر اللہ خان، اور امیر خان جان شیر نے کشمیر پر بطور گورنر حکومت کی۔ آخرالذکر کی اہمیت یہ ہے کہ جب کابل کا حکمران تیمور شاہ مقامی سازشوں کو فرو کرنے میں مصروف تھا تو امیر جان شیر نے کشمیر پر اپنی حکمرانی کا اعلان کر دیا۔ لیکن تیمور شاہ کے سپہ سالار حاجی کریم داد خان نے اسے شکست دے کر ایک دفعہ پھر افغان حکومت بحال کر دی۔ ۱۷۸۴ء میں کشمیر میں اسد خان افغان گورنر مقرر تھا۔ اس کے ذہن میں خود مختاری کا ہوا سمایا تو اس نے کابل سے بغاوت کر دی اور نادر شاہ ثانی کا لقب اختیار کر کے اپنی حکومت کا اعلان کر دیا۔ اسد خان کا عہد حکومت بھی زیادہ طویل نہیں، اسے مدد خان نے شکست دی۔

کشمیر میں افغان حکومت کا آخری گورنر جبار خان تھا۔ اس کے عہد میں ایک کشمیری پنڈت بیربل دھر کو مختلف وسائل سے معلوم ہوا کہ پنجاب کا سکھ حکمران راجہ رنجیت سنگھ کشمیر کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ اس نے لاہور دربار کے مخبر کے طور پر کام کرنا شروع کر دیا اور آخر موقع محل غنیمت سمجھ کر رنجیت سنگھ کو حملے کی دعوت دے دی۔ رنجیت سنگھ عرصے سے کشمیر پر دندان آز تیز کر رہا تھا۔ اس سے قبل ۱۸۱۲ء اور ۱۸۱۴ء میں

اسے پسپائی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ لیکن اب اسے کشمیری پنڈتوں کا تعاون حاصل ہو گیا تو اس کے ایک پرانے خواب کی تعبیر سامنے نظر آنے لگی۔ سکھوں کی فوج کی قیادت مصر دیوان چند نے کی۔ جبار خان کی فوج نے ۱۵ جولائی ۱۸۱۹ء کو شوپیان کے مقام پر شکست کھائی اور اس کے ساتھ ہی افغانوں کا ۶۷ برس کا عہد حکومت ختم ہو گیا اور کشمیر سکھوں کے زیر نگین آ گیا۔ رنجیت سنگھ اس فتح پر اتنا خوش تھا کہ اس نے امرتسر اور لاہور میں تین دن تک رنگ رلیاں منانے کا حکم دیدیا۔ عمارتوں پر چراغاں کیا گیا اور محفلوں میں شراب کے مٹکے لنڈھائے گئے۔ رنجیت سنگھ کے دل میں کشمیر کے باغات میں آوارہ خرامی کی شدید خواہش تھی لیکن قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ وہ اس جنت نظیر خطے میں ایک دفعہ بھی اپنا قدم نہ رکھ سکا۔ لاہور دربار کی سازشوں نے اسے کشمیر کی طرف جانے کی فرصت ہی نہ دی۔

سکھوں کا عہد حکومت

کشمیر پر سکھوں نے ۱۸۱۹ء سے لے کر ۱۸۴۶ء تک حکومت کی۔ سکھوں کا پہلا گورنر مصر دیوان چند تھا۔ اس کے بعد جو گورنر مقرر ہوئے، ان میں موتی رام، کرپارام، پرنس شیر سنگھ اور کرنل مہان سنگھ کشمیر کے چند قابل ذکر گورنر ہیں۔ لیکن ان سب کے عہد میں کشمیر کو وہ امن و آشتی نصیب نہیں ہوئی جو اسے مغلوں کے عہد حکومت میں حاصل تھی۔ یہ دور حقیقی معنوں میں سکھا شاہی کا دور تھا۔ اور اس میں ہر طرف انتشار ہی انتشار نظر آتا ہے۔ کشمیر میں متعین سکھوں کے فوجی دستے اپنی من مانی سے کشمیری عوام پر ستم رانی کرتے تھے۔ گورنر کشمیر کا حکم تسلیم کرنے کے بجائے وہ اپنے سکھ کمانڈر کے احکام کی تعمیل زیادہ کرتے تھے۔ لاقانونی اور بدعنوانی کا دور دورہ تھا۔ عوام سہمے، سہمے رہتے، عورتوں کی عصمت لوٹ لی جاتی اور مردوں کو بغیر اجرت کے بیگار کرنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ ۱۸۳۹ء میں راجہ رنجیت سنگھ کو موت نے آ لیا۔ تو پنجاب کے علاوہ کشمیر میں بھی وسیع پیمانے پر ابتری پھیل گئی۔ اس وقت کشمیر کا گورنر امام الدین تھا لیکن وہ حالات پر قابو نہ پا سکا۔ ۱۶ مارچ ۱۸۴۶ء کو ڈوگروں اور انگریزوں کے درمیان معاہدہ امرتسر طے پا گیا تو گورنر امام الدین نے عنان اقتدار ڈوگرہ راجہ گلاب سنگھ کو سونپ دی۔ اس وقت پنجاب میں سکھوں کو شکست ہو چکی تھی اور صوبے پر انگریزوں کا تسلط مکمل ہو چکا تھا۔ ۹ مارچ ۱۸۴۶ء کے معاہدہ لاہور کے مطابق سکھوں نے دریائے بیاس اور سندھ کا درمیانی علاقہ اور ہزارہ اور کشمیر کے صوبوں کو ساڑھے تین کروڑ روپے تاوان جنگ ادا نہ کر سکنے کی وجہ سے انگریزوں کے حوالے کر دیا تھا۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ انگریزوں نے کشمیر کو اپنی سلطنت کے ساتھ ملحق کرنے کے بجائے اس خطے کو ۷۵ لاکھ روپے کے عوض گلاب سنگھ ڈوگرہ کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ معاہدہ امرتسر کا اقتباس حسب ذیل ہے:

"برٹش گورنمنٹ دریائے سندھ کے مشرق اور دریائے راوی کے مغرب میں واقع سلسلہ کوہ کا علاقہ بشمول چمبہ اور بہ اخراج لاہور دوامی طور پر خودمختارانہ اور آزادانہ حکومت کے لئے مہاراجہ گلاب سنگھ اور اس کے مرد ورثا کو دیتی ہے۔ یہ علاقے ریاست لاہور کا حصہ ہیں اور ان علاقوں پر برٹش گورنمنٹ کو ۹ مارچ ۱۸۴۶ء کے معاہدہ لاہور کی دفعہ ۴ کے تحت تسلط حاصل ہوا ہے۔"

کشمیر میں ڈوگرہ شاہی کے سو سال

کشمیر پر ڈوگرہ شاہی حکومت تقریباً ایک سو برس پر محیط ہے۔ اس عرصے میں یہاں چار ڈوگرہ راجاؤں نے رون اولیٰ کے وحشیانہ انداز میں حکومت کی۔ گلاب سنگھ نے ۱۸۴۶ء سے ۱۸۵۷ء تک، مہاراجہ رنبیر سنگھ نے ۱۸۵۷ء سے ۱۸۸۵ء تک، مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے ۱۸۸۵ء سے ۱۹۲۵ء تک عنان اقتدار سنبھالی۔ پرتاپ سنگھ لاولد را تو اس کا بھتیجا مہاراجہ ہری سنگھ کشمیر کا حکمران بنا۔ اور یہ کشمیر کا آخری ڈوگرہ مہاراجہ تھا۔ اس کا عہد حکومت ۱۹۲۵ء تا ۱۹۵۲ء تک ۲۷ برسوں پر پھیلا ہوا ہے۔ ڈوگرہ راجے منصفانہ، مربیانہ اور عادلانہ حکمرانی کے رموز سے آشنا نہیں تھے۔ انتظامی امور سنبھالنے اور رعایا کو مراعات دینے کا انہیں سلیقہ نہیں تھا۔ انہوں نے رعایا کشی کا انداز اختیار کیا اور ان کے جسم سے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ لینے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ شخصی حکمرانی کا یہ دور کشمیر کی تاریخ کا بدترین دور ہے۔ ڈوگرہ مہاراجہ کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ قانون کا درجہ رکھتا تھا۔ اور کچلے ہوئے عوام کو سرتابی کی مجال نہیں تھی۔ اس زمانے میں لوگ مغل راج کی برکتوں کو یاد کرتے اور چھپ چھپ کر روتے تھے۔ مطلق العنانی نے عوام کے حقوق کو غصب کرنے کی طرح ڈالی تو انگریزوں نے مہاراجہ کو عضو معطل بنانے اور اس علاقے پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے عہد میں ہی کشمیر کے انتظامی امور کے لئے ایک کونسل قائم کر دی گئی جو برٹش انڈین گورنمنٹ کے وفاداروں پر مشتمل تھی، چنانچہ جگ موہن نے رائے دی ہے کہ اس عہد کو ڈوگرہ راج کے بجائے ڈوگرہ برٹش عہد شمار کیا جائے تو یہ بالکل درست ہوگا۔

مسلمانوں کی زبوں حالی

کشمیر کے باشندوں پر اس عہد میں عرصہ حیات تنگ ہو گیا۔ روزگار کے وسائل محدود تھے۔ مذہبی آزادی حاصل نہیں تھی۔ اونچی آواز سے اذان دینا ممنوع تھا۔ ہندوؤں کو تمام مراعات حاصل تھیں لیکن ریاست میں مسلمانوں کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ ان کی ترقی کے تمام ذرائع مسدود تھے، چنانچہ جموں کے علاقے سے متعدد خاندانوں نے سیالکوٹ کا رخ کیا۔ سرینگر کے نواح کے لوگ راولپنڈی میں اور پٹھان کوٹ کے راستے سے آنے والے خاندان امرتسر میں آکر آباد ہو گئے۔ موسم سرما میں جب کشمیر میں برف باری شروع ہو جاتی تو کشمیری باربردار پنجاب کے قریباً تمام شہروں میں روزگار کی تلاش میں نکل آتے۔ کشمیر کے دستکاروں کی مصنوعات بھی پنجاب کے راستے سے ہی پورے برصغیر میں پہنچائی جاتی تھیں، چنانچہ بہت سے دستکار پنجاب میں آکر مستقل طور پر آباد ہو گئے۔ ریاست میں چونکہ ڈوگرہ راج تھا، اس لئے کشمیری پنڈتوں اور دوسرے ہندوؤں کو برتر قوم کا درجہ حاصل تھا۔ انہیں ہر قسم کی آزادی حاصل تھی۔ مراعات سے نوازا جاتا تھا، ان پر اعتماد کیا جاتا اور ان کے معمولی حقوق کی بھی نگہداشت کی جاتی تھی۔ دوسری طرف اس خطے پر چونکہ مسلمان ایک طویل عرصے تک حکمرانی کر چکے تھے، اس لئے ا... کے خلاف نہ صرف عناد کا جذبہ پرورش پا رہا تھا بلکہ انہیں کافر اور ملیچھ سمجھا جاتا تھا۔ مسلمانوں کو

بدگمانی اور بداعتمادی کی فضا میں زندگی بسر کرنی پڑتی تھی۔ مہاراجہ کر ہر وقت یہ خطرہ لاحق رہتا تھا کہ مسلمان اس کی حکومت کا تختہ الٹ دیں گے۔ اس خطرے کے پیش نظر ان پر ملازمتوں کے دروازے بند اور تعلیم کی مراعات سے بڑی حد تک محروم کر دیا گیا۔ چنانچہ کشمیری مسلمانوں کو ملازمت کی تلاش کیلئے بھی پنجاب ہی کا رخ کرنا پڑتا تھا۔ غریب عوام پر ٹیکسوں کی بھرمار تھی۔ نادار کسانوں کی ساری کمائی مالیہ اور آبیانہ ادا کرنے میں صرف ہو جاتی تھی۔

تحریک خلافت اور تحریک عدم تعاون کے بعد ہندوستانی رعایا پر انگریزوں نے سختی شروع کر دی اور اس کا اثر کشمیری مسلمانوں پر بھی پڑا۔ ان تحریکوں میں حصہ لینے کے جرم میں کشمیری مسلمانوں کو یہ سزا دی گئی کہ ان پر بیرون کشمیر بالخصوص پنجاب میں ملازمتوں کا حصول ناممکن بنا دیا گیا۔ چنانچہ کشمیری مسلمانوں کو اب روزی روزگار کے لئے بھی اندرون ریاست ہی مواقع تلاش کرنے پڑے جس سے محرومی اور بے بسی کے جذبات دو چند ہو گئے۔ مہاراجہ ہری سنگھ تنگ نظر اور ہندو پرست تھا۔ مسلمانوں کو کسی بڑے عہدے پر فائز کرنا اسے کسی صورت میں بھی قبول نہیں تھا۔ انگریز ہندوستان میں رعایا پر سخت گیری کرنے لگے تو مہاراجہ کشمیر نے بھی مسلمانوں کے لئے آہنی رویہ اختیار کر لیا۔ ان کے مذہبی فرائض کی بجاآوری میں مزاحمت شروع کر دی گئی۔ جاں باز میرزا مرحوم نے "حیات امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری" میں لکھا ہے کہ

"جموں میں ریاستی پولیس کا ایک مسلمان سپاہی اپنی بیرک میں قرآن کریم کی تلاوت کر رہا تھا کہ بغیر کسی نزاع کے ایک ہندو سپاہی نے مسلمان سپاہی کے ہاتھ سے قرآن کریم چھین کر زمین پر دے مارا"

اس قسم کے واقعات ریاست میں اکثر ہوتے رہتے تھے۔ ہندو اپنی مذہبی رسوم پوری شان و شوکت کے ساتھ مناتے لیکن مسلمان مساجد میں بلند آواز سے تلاوت بھی کرتے یا اونچی آواز میں اذان بھی دیتے تو دنگا فساد ہو جاتا تھا۔

کشمیریوں کی پنجاب کی طرف نقل مکانی

ریاست کشمیر کے باشندوں کی آمدورفت کا سلسلہ پنجاب میں شروع ہوا تو محرومیوں کا احساس روز بروز جڑ پکڑنے لگا۔ ڈوگرہ راج کے ظلم و ستم کے خلاف مسلمانوں کی مظلومی اور کسمپرسی نے بھی رد عمل ظاہر کرنا شروع کر دیا اور کشمیر کے پسماندہ، نادار اور پامال لوگوں کے دلوں میں بھی ظلم کے خلاف آواز اٹھانے اور اپنے حقوق حاصل کرنے کا جذبہ بیدار ہونے لگا۔ چنانچہ بیسویں صدی کے ربع دوم میں جب جذبات کا جوالا مکھی سلگتے سلگتے لاوا فشانی پر آیا تو "کشمیر تحریک" شروع ہو گئی جس کی قیادت متوسط طبقے کے مسلمانوں کی جماعت احرار نے کی۔

چودھری افضل حق نے "میرا افسانہ" میں لکھا ہے:

"ہر چند ہم خود غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ لیکن دنیا کی مظلوم ترین آبادی پر ظلم کی انتہا دیکھ کر جگر خون ہو گیا۔ ہندوستان کا ہر باشندہ سیاسی ذلت اور اقتصادی لوٹ کھسوٹ کے لحاظ سے رحم کا حقدار ہے لیکن کشمیر کے لوگوں کی حالت ہم غلاموں کے رحم کی زیادہ مستحق تھی۔ احرار ابھی جیلوں سے رہا ہو کر آئے تھے۔ کسی اور جھگڑے میں مبتلا ہونا طبیعت پر بوجھ تھا۔ لیکن کشمیر کے دردمندوں کی صداؤں نے اہل دل لوگوں پر نیند حرام کر دی"۔ (میرا افسانہ۔ صفحہ ۱۷۶)

تحریک کشمیر ۱۹۳۱ء

عبداللہ ملک نے خیال ظاہر کیا ہے کہ

"مجلس احرار اسلام کے قیام کے بعد سب سے پہلی ہنگامہ خیز تحریک جو مجلس احرار کی قیامت میں چلی اور جس نے پورے شمالی ہندوستان میں تہلکہ مچا دیا، وہ کشمیر کی تحریک تھی۔ یہی وہ پہلی تحریک تھی جس نے ایک طرف کشمیر اور جموں کی ریاست میں بسنے والے مسلمانوں کو بیدار اور متحرک کیا اور دوسری طرف پنجابی مسلمانوں کو گرمایا"۔

(پنجاب کی سیاسی تحریکیں۔ صفحہ ۱۵۳)

مجلس احرار نے اگرچہ تحریک کشمیر کی قیادت ۱۹۳۱ء میں سنبھالی لیکن اس تحریک کا لاوا ۱۹۲۰ء کے بعد پکنا شروع ہو گیا تھا۔ اور اس کی آواز اخبارات سے بھی ابھرنے لگی تھی۔ مولانا عبدالمجید سالک نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں لکھا ہے کہ

"کشمیر میں ڈوگرہ راج کے ظلم و ستم اور مسلمانوں کی مظلومی و کسمپرسی کے خلاف "انقلاب" میں بے شمار مراسلتیں شائع ہوئیں اور بہت سے مضامین لکھے گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کشمیر کے اندر تمام پڑھے لکھے لوگ "انقلاب" کو پڑھنے لگے اور رفتہ رفتہ عوام میں بیداری پیدا ہونے لگی۔ "انقلاب" میں اس مہم کا آغاز یوں ہوا کہ اس سے "پیشتر ینگ مینز مسلم ایسوسی ایشن" جموں کے بعض مخلص کارکنوں نے لاہور کے انگریزی اور ایک اردو روزنامے میں مہاراجہ سرہری سنگھ کی حکومت کے خلاف مضامین لکھے۔ لیکن چند ہی ہفتوں کے اندر ان اخباروں کے ایڈیٹروں نے چند ٹکوں کی خاطر حکومت کشمیر سے ربط پیدا کر لیا اور مراسلہ نگاروں کے نام ظاہر کر دیئے جن پر مہاراجہ کی حکومت کا عتاب نازل ہو گیا اور کارکنوں میں دہشت پھیل گئی۔"

مولانا عبدالمجید سالک کو جب جموں کے ایک اخبار نویس آ کر ملے اور کشمیری مسلمانوں کے دکھ درد کی داستان سنائی تو وہ ان کی خدمت پر آمادہ ہو گئے اور "انقلاب" نے نامہ نگاروں کے نام صیغہ راز میں رکھنے کا یقین دلا کر اس مہم کا آغاز کر دیا جس کے تحت ملازمتوں میں مسلمانوں کا تناسب، صناع مسلمانوں کی مظلومی اور مقروضی، تبدیلی مذہب، ذبح بقر کی پاداش میں ضبطی جائیداد اور دس سال قید کی سزا، عام جبر و تشدد، ناقابل برداشت ٹیکسوں کا بوجھ وغیرہ کے خلاف مدلل مضامین لکھے گئے اور دستاویزی ثبوت پیش کئے گئے۔ "انقلاب" کی یہ آواز صدا بصحرا ثابت نہ ہوئی اور مہاراجہ ہری سنگھ نے ۱۹۲۷ء میں مسلمان رعایا کو سول اور فوجی ملازمتوں میں نسبتاً زیادہ حصہ دینے کا اعلان کیا۔ لیکن یہ محض ایک کاغذی اعلان تھا۔ جس پر عمل درآمد کبھی نہیں ہوا۔ ۱۹۳۰ء میں مذہبی لحاظ سے کشمیر کی آبادی کی تقسیم حسب ذیل ہے:

۱۔ مسلم	۲۴ لاکھ
۲۔ ہندو	۷ لاکھ
۳۔ سکھ	۳۹ ہزار
۴۔ بدھ	۳۹ ہزار

کل آبادی قریباً ۳۲ لاکھ

اب چند سرکاری محکموں میں ملازمتوں کا ہندو مسلم تناسب ملاحظہ کیجئے۔

محکمہ تعلیم	غیر مسلم	مسلمان
گزیٹڈ آفیسر	۲۳	۴
انسپکٹر	۱۱	۳
پروفیسر	۲۹	۴
استاد	۱۴۸۳	۷۱۸
محکمہ تعمیرات عامہ ۱۸۳		۵۴
محکمہ خزانہ (کلرک) ۳۶۸		۲۹

(اعداد و شمار بحوالہ "پنجاب کی سیاسی تحریکیں")

مسلم کشی کے واقعات اور اخبارات

راجہ ہری سنگھ کے خلاف اخباری مقالات کا یہ سلسلہ روز بروز طول پکڑنے لگا تو کشمیر میں "انقلاب" کا داخلہ بند کر دیا گیا۔ لیکن اس بندش نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ مزید یہ ہوا کہ اسی دور میں چند ایسے واقعات ظہور میں آئے جن سے مسلمانوں کے مذہبی جذبات شدت سے مجروح ہوئے۔ "انقلاب" نے ان کی رپورٹنگ بڑی جرات مندی سے کی۔ چند واقعات حسب ذیل ہیں:

۱۔ صوبہ جموں میں تحصیل اودھم پور کا ایک بڑا زمیندار اپنا مذہب چھوڑ کر مسلمان ہو گیا تو تحصیل دار نے مال کے کاغذات سے اس کا نام خارج کر دیا۔ ریاستی عدالت نے زمیندار کو شدھ ہو جانے کی ہدایت کی لیکن اس نے اسلام چھوڑنے سے انکار کر دیا تو اس کا مقدمہ خارج کر دیا گیا۔

۲۔ کشمیر کے ایک گاؤں ڈیگور میں مسلمانوں کو باجماعت نماز ادا کرنے سے روک دیا گیا۔ اس خبر نے کشمیر کے مسلمانوں میں غم و غصہ کی لہر دوڑا دی۔

۳۔ جموں جیل کی پولیس لائن میں ایک ہندو سپاہی نے ایک مسلمان کانسٹیبل کے سامنے توہین قرآن کی اور قرآن کے اوراق زمین پر پھینک دیئے۔

۴۔ عیدالاضحیٰ کے موقعہ پر ایک آریہ ڈپٹی انسپکٹر پولیس نے خطیب کو عید کا خطبہ پڑھنے سے روک دیا۔ اس نے خطیب کے اس دعوے کو مسترد کر دیا کہ خطبہ نماز عید کا ضروری جزو اور مذہبی فریضہ ہے۔

ویکفیلڈ تحقیقاتی کمیٹی

قرآن مجید کی توہین کے مسئلہ نے جب احتجاج کی آواز کو بہت بلند کر دیا تو مہاراجہ ہری سنگھ نے مسٹر ویکفیلڈ کو تحقیقات کے لئے جموں بھیجا۔ اس تحقیقات میں مسلمانوں کی طرف سے ایم یعقوب علی اور سید الطاف علی شاہ کو بطور نمائندہ شریک کیا گیا۔ تینوں نے توہین قرآن کو تسلیم کیا۔ تاہم مسٹر ویک فیلڈ نے اسے اتفاقی امر

اور ایم یعقوب علی نے اسے غصے کا نتیجہ قرار دیا۔ تیسرے رکن الطاف علی شاہ کا خیال تھا کہ قرآن ہاتھ سے نہیں چھینا گیا، بلکہ یہ بستر پر پڑا تھا اور اسے بستر سے اٹھا کر زمین پر پھینک دیا گیا۔

ریاستی حکام نے اس تحقیقات کی رپورٹ پر جو فیصلہ دیا، اس کے مطابق مسلمان کانسٹیبل کو ملازمت سے برطرف کر دیا گیا اور توہین قرآن کے مرتکب ہندو کانسٹیبل کو پنشن پر بھیج دیا گیا۔ اس غیر منصفانہ فیصلے پر پورے کشمیر میں غصے اور نفرت کی آگ بھڑک اٹھی۔ کشمیر کے ممتاز رہنما چودھری غلام عباس اور شیخ محمد عبداللہ کو اس واقعے نے ہی کشمیر کی سیاست میں مسلمانوں کے اولین نمائندوں کے طور پر متعارف کرایا تھا۔ امروہہ کے ایک مسلمان عبدالقدیر نے سرینگر میں ایک ولولہ انگیز تقریر کر کے کشمیری مسلمانوں کو غیرت دلائی۔ اس نے ناموس محمد ﷺ کی حفاظت کیلئے اپنی جانیں قربان کر دینے کی تحریک کی تھی چنانچہ اسے گرفتار کر لیا گیا۔ عبدالقدیر کا مقدمہ سرینگر جیل میں پیش ہوا۔ جیل کے باہر عوام نے اندر جانے کے لئے زبردست مظاہرہ شروع کر دیا۔ عوام کے اس پرجوش ہجوم کو روکنے کے لئے پولیس نے گولی چلادی۔ چنانچہ ۲۱ مسلمان شہید اور سینکڑوں زخمی ہو گئے۔

مسلمانوں کی شہادت کی خبر سرینگر شہر میں پہنچی تو پورے شہر میں ہڑتال کر دی گئی۔ عوام کا ہجوم شہر کے کوچہ و بازار میں مہاراجہ کشمیر کے خلاف نعرے لگا رہا تھا۔ ایک ہندو دکان بند کرنے اور ہڑتال میں شریک ہونے پر آمادہ نہیں تھا۔ اس کی دکان لوٹ لی گئی۔ اس واقعے نے معاملات کا رخ فوراً فسادات کی طرف کر دیا۔ شہر میں ہنگامہ عام شروع ہو گیا۔ چودھری غلام عباس اور شیخ عبداللہ کو گرفتار کر لیا گیا۔ مولانا چراغ حسن حسرت نے لکھا ہے کہ

"اس پکڑ دھکڑ کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔ لوگوں کا جوش گھٹنے کے بجائے بڑھتا گیا۔ کئی دن مسلسل ہڑتال رہی۔ عورتوں اور بچوں کے جلوس نکلے۔ کہیں کہیں ہنگامے بھی ہوئے۔ ایک آدھ جگہ پھر گولی چلی۔ شہر تو خیر شہر تھا، جلسوں اور جلوسوں کا سلسلہ دیہات تک جا پہنچا۔"

کشمیر کمیٹی

کشمیری حکام کا خیال تھا کہ شیخ عبداللہ جیسے نوجوانوں کا جوش و خروش عارضی ہے اور اگر انہیں قید سے رہا کر دیا گیا تو معاملات سدھر جائیں گے۔ راجہ ہری سنگھ نے انہیں وعدوں کے ایسے سبز باغ دکھائے کہ نوجوان چکمے میں آ گئے اور سمجھنے لگے کہ انہوں نے میدان مار لیا ہے۔ لیکن اس وقت اشتعال کشمیر کی حدود سے باہر نکل چکا تھا۔ اور نہ صرف درمیانی طبقے کے مسلمان متاثر تھے بلکہ بالائی طبقہ کے لوگ بھی پریشان تھے۔ چنانچہ جولائی ۱۹۳۱ء کے آخری ہفتہ میں سر ذوالفقار علی کی کوٹھی پر شملہ میں مسلمان عمائدین کا ایک اجلاس منعقد ہوا۔ جس میں مندرجہ ذیل اصحاب نے شرکت کی:

۱۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال

۲۔ خواجہ حسن نظامی

۳- امام جماعت (قادیانی) مرزا بشیر الدین محمود
۴- نواب سر ذوالفقار علی
۵- سید محسن شاہ
۶- خان بہادر شیخ رحیم بخش
۷- مولانا اسمٰعیل غزنوی
۸- عبدالرحیم درد
۹- مولانا نورالحق (روزنامہ "آؤٹ لک")
۱۰- سید حبیب مدیر "سیاست"

مرزائیوں کے خلاف رد عمل

ریاست کشمیر و جموں کی نمائندگی مولوی عبدالرحیم ایم اے اور اللہ رکھا ساغر نے کی۔ صوبہ سرحد کا نمائندہ صاحبزادہ عبداللطیف تھا۔ اس اجلاس میں ایک کشمیر کمیٹی تشکیل دی گئی جس کے صدر مرزا بشیرالدین محمود اور سیکرٹری عبدالرحیم درد مقرر ہوئے۔ ان دونوں کا تعلق قادیانی جماعت سے تھا اور اول الذکر تو اس جماعت کے خلیفہ تھے جنکی شرکت مسلمانوں کو قبول نہیں تھی۔ چنانچہ اس کمیٹی میں ابتدا ہی میں خرابی کی صورت پیدا ہو گئی۔ اس خرابی کا نوٹس سب سے پہلے مجلس احرار اسلام نے لیا۔ چودھری افضل حق نے لکھا ہے کہ

"اس کمیٹی نے ریزولیوشن پاس کر کے حکام ریاست کو بھیجا کہ ہم تحقیقات کے لئے آرہے ہیں۔ جواب ملا کہ حدود ریاست میں قدم رکھا تو دھر لئے جاؤ گے۔ بس اچھل کود کر رہ گئے۔ اب ان امرائے اسلام نے کفر کی پناہ ڈھونڈی۔ قادیان کے متنبی کے بیٹے کو اپنا سردار بنا لیا۔ تاکہ حکومت انگریزی مرزائیت کے خود کاشتہ پودے کا سایہ ان پر دراز دیکھے گی تو حمایت پر آمادہ ہو جائے گی۔ یا کم از کم ان کی سرگرمیوں کے متعلق شبہ کی گنجائش نہ رہے گی۔" (میرا افسانہ۔ ص ۱۷۷)

مجلس احرار نے کشمیر کمیٹی کو انگریزوں کی سازش تصور کیا۔ اس کی وجوہ حسب ذیل ہیں:

۱- قادیانی برسر اقتدار حکومت کی وفاداری کا دم بھرتے تھے اور سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لیتے تھے۔
۲- ختم نبوت کے مسئلہ پر عامۃ الناس کو قادیانیوں سے شدید اختلافات تھے۔
۳- قادیانی جماعت جہاد کے عمل سے عاری اور قربانی کے جذبے سے خالی تھی۔ اس کے سامنے صرف اپنی جماعت کے مقاصد تھے۔
۴- کشمیر کمیٹی کی صدارت سے قادنیوں کو کشمیر میں اپنے فرقے کی تبلیغ کے مواقع حاصل ہو سکتے تھے۔
۵- قادیانی جماعت کا خلیفہ اس نامزدگی سے ہندوستان کے عام مسلمانوں کو بھی متاثر کر سکتا تھا۔ جس سے ان کے تبلیغی عمل کو تقویت مل سکتی تھی اور ارتداد کا سلسلہ طول پکڑ سکتا تھا۔ چودھری افضل حق کے دل میں جو لاوا ابل رہا تھا، اس کا اظہار مندرجہ ذیل اقتباس سے عیاں ہے:

"میں ان دنوں اپنے گاؤں گڑھ شنکر میں بیٹھا ان واقعات اور حالات کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس پیدا شدہ صورت حال سے گھبرا گیا اور لاہور پہنچا۔ میں نے دیکھا کہ مولانا داؤد غزنوی ٹانگے پر سوار پریشان سے جا رہے ہیں۔ پوچھا۔۔۔۔ "کدھر کا عزم ہے؟"

کہا کہ "مرزائی قیادت مسلمانوں کی تباہی کا باعث ہو گی، میں شہر کے علما سے مل کر ان کی قیادت کے خلاف اعلان کرانا چاہتا ہوں"۔

میں نے کہا " بھائی محض کاغذی بم قوموں کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لئے کافی نہیں۔ اب تو بڑی قربا ہی مشکلات کا حل ہے۔ سواری چھوڑ دو تا کہ دفتر میں بیٹھ کر تدبر کے گھوڑے دوڑائیں اور ہمت مردانہ سے قسمت محمد پھونکیں اور تدبیر سے تقدیر کو بدلیں۔"

مجلس احرار کی قیادت

احرار رہنماؤں نے سب سے پہلے علامہ اقبال کو اپنے خدشات سے آگاہ کیا اور تقاضا کیا کہ وہ کشمیر کمیٹی سے علیحدگی کا اعلان کر دیں۔ اگلے دن ڈاکٹر اقبال کی صدارت میں برکت علی محمڈن ہال میں کمیٹی کا جلسہ ہوا تو بعض ارکان کی مخالفت کے باوجود علامہ اقبال نے تحریک کشمیر کی قیادت احرار کے سپرد کر دی۔ جماعت احرار کے سرفروش ہر ممکن قربانی کے لئے تیار تھے۔ تحریک کی قیادت کے لئے مولانا مظہر علی اظہر کو نامزد کیا گیا۔ چودھری افضل حق، مولانا مظہر علی اظہر اور خواجہ غلام محمد پر مشتمل ایک وفد ترتیب دیا گیا۔ اس وفد کو یہ فریضہ سونپا گیا کہ وہ کشمیر جا کر حکام کے ساتھ بات چیت کرے تا کہ حالات میں سدھار کی صورت پیدا ہو۔ لیکن ڈوگرہ حکمرانوں نے اس وقت کشمیر میں آمد و رفت پر پابندی عائد کر رکھی تھی، خبروں پر سنسر لگا ہوا تھا اور پورا خطہ افواہوں کی لپیٹ میں آیا ہوا تھا۔ کشمیری حکام نے احرار رہنماؤں کے ساتھ بھی یہی سلوک کرنے کا ارادہ کیا۔ وہ انہیں ایسی سزا دینے کا فیصلہ کر چکے تھے کہ پھر برسوں تک بیرون کشمیر سے ہری سنگھ ڈوگرہ کے خلاف کوئی شخص آواز اٹھانے کی کوشش نہ کرے اور کشمیری عوام اس کے ڈوگرہ حکام کے ظلم و ستم کو بے چون و چرا برداشت کرتے رہیں۔

چودھری افضل حق "تاریخ احرار" میں رقم طراز ہیں کہ

"اس عرصہ میں کشمیر میں گولی چلائی گئی۔ ایک بے گناہ شہید اور کئی مجروح ہو گئے۔ ایسا معلوم ہوا کہ سارے خطے کو آگ لگ گئی ہے اور پوری ریاست اس کی لپیٹ میں آ گئی ہے۔ ریاستی مظالم سے تنگ آئی ہوئی اور بھوکوں ماری ہوئی مخلوق کی شمع زندگی بجھنے سے پہلے ایک آخری تڑپ دکھانے پر آمادہ تھی۔۔۔۔ قرار پایا کہ مولانا مظہر علی اظہر فوراً ریاست کو تحقیقاتی وفد کے لئے لکھ دیں، اجازت نہ بھی ملے تو وفد کے ارکان اپنے مذہبی رجحانات کے مطابق "علی" علی کہہ کر جائیں"۔

مجلس احرار کے مکتوب پر کشمیر سرکار نے انگریزی حکومت سے سلسلہ جنبانی شروع کر دیا۔ مقصد معاملے کو طول دینا تھا اور جب احرار کو تادیر کوئی جواب نہ ملا تو لاہور کے مقامی افسروں کی معرفت ریاست تک یہ خبر پہنچا دی گئی کہ اگر اجازت نہ دی گئی تو احرار بن بلائے مہمان کی طرح آ ٹپکیں گے۔ جواب میں کہلوایا گیا کہ "اس صورت میں اگر احرار پر جیل کے دروازے کھول دیئے گئے تو وہ کیا کریں گے؟"۔۔۔۔۔ مجلس احرار نے کہا "ہم بھی

آفت جان بن جائیں گے"۔۔۔۔۔۔

تحریک کشمیر کا عملی آغاز

ہر چند کہ تاخیری حربے ریاستی سطح پر استعمال ہو رہے تھے لیکن اس عرصے میں احرار خاموش نہیں بیٹھے۔ تحریک کے آغاز ہی میں پنجاب کے مختلف مقامات پر "یوم کشمیر" منانے اور عوام کی ہمدردیاں حاصل کرنے اور کشمیری عوام پر ہونے والے ظلم و ستم کی آواز لوگوں تک پہنچانے کی کوشش شروع کر دی گئی۔ جب تاخیر کا سلسلہ ختم نہ ہوا تو مجلس احرار کی مجلس عملہ نے فیصلہ کیا کہ مزید انتظار نہ کیا جائے اور احرار کا وفد اپنی بے سروسامانی کو خاطر میں لائے بغیر سرینگر روانہ ہو جائے۔ لاہور کی ایک شخصیت چودھری اللہ بخش گنائی نے وفد کو زادراہ کے طور پر ساڑھے تین صد روپے فراہم کئے۔ جس کا بندوبست انہوں نے اپنی بیوی کے زیورات بیچ کر کیا تھا۔ رات کو ایک جلسہ گوجرانوالہ میں ہوا۔ اس جلسے میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے ولولہ انگیز تقریر کر کے لوگوں کے جذبات میں آگ لگادی۔ گوجرانوالہ کے درودیوار "تحریک کشمیر زندہ باد"۔ "مجلس احرار زندہ باد" کے نعروں سے گونج اٹھے۔ گھر گھر کشمیریوں پر اٹھائے گئے مظالم کی داستانیں بیان ہونے لگیں۔

سیالکوٹ کو چودھری افضل حق نے احرار کا مدینہ قرار دیا۔ وفد یہاں پہنچا تو اسٹیشن پر لوگوں کا اژدہام تھا۔ جموں کا گورنر حالات کا جائزہ لینے کے لئے سیالکوٹ میں پہنچا ہوا تھا۔ اس نے عوام کا ولولہ، جوش اور سیمابی اضطراب دیکھا تو ششدر رہ گیا۔ اس نے وزیر اعظم کشمیر کو تار دیا کہ "احرار وفد کو کشمیر میں داخلے سے روکنا خطرے سے خالی نہیں۔ یہ ریاست کے لئے فوری پریشانی کا باعث ہوگا۔"۔۔۔۔۔ اس طرح گورنر نے وفد کے داخلے کی اجاز حاصل کر لی۔

احرار وفد کی ناکامی

وفد سرینگر پہنچا تو ریاستی حکام نے اس کے ارکان کو شیشے میں اتارنے کی کوشش کی۔ وزیر اعظم کشمیر سر ہری کشن کول کا پرسنل سیکرٹری چودھری افضل حق کی مزاج پرسی کیلئے ان کے ہاؤس بوٹ میں آیا۔ اور یہ واضح کرنے کی کوشش کی کہ ڈوگرہ شاہی انگریزی فوج کی مدد کے بغیر اور ریاستی پولیس کی قوت سے حالات پر قابو پانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ دوسری طرف چودھری افضل حق نے دلائل سے یہ حقیقت باور کرائی کہ تحریک کشمیر عوام الناس کے گہرے اقتصادی اور سیاسی زخموں کے مندمل نہ ہونے والے گھاؤ کا نتیجہ ہے اور اس تحریک سے حالات بے قابو تو ہو سکتے ہیں، ان کو گرفت میں لانا ممکن نہیں۔

اگلے دن پرسنل سیکرٹری نے وزیر اعظم کشمیر کا پیغام پہنچایا کہ چودھری صاحب کشمیر کی سیاسیات کے بارے میں اپنی گزشتہ روز کی رائے قلم بند کر دیں۔ لیکن اس تحریری رائے کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ احرار وفد کے لیڈر مولانا مظہر علی اظہر مہاراجہ کشمیر سے بھی ملے لیکن حالات نے مثبت رخ اختیار نہ کیا۔ اسی دوران میں شیخ عبداللہ کو جواب کشمیری لیڈر بن چکے تھے۔ گرفتار کر لیا گیا۔ احرار وفد پر پابندیاں سخت کر دی گئی۔ چودھری افضل حق وزیر

اعظم کشمیر سر ہری کشن کول سے اس زمانے سے واقف تھے جب وہ جالندھر میں کمشنر تھا۔ لیکن سیاست میں تعلقات اور شناسائی کی اہمیت لمحہ بہ لمحہ حالات کے تقاضوں کے مطابق بدلتی رہتی ہے۔ وزیر اعظم کشمیر نے چودھری افضل حق کی بات سنی لیکن ان کا کوئی مطالبہ قابل قبول نہ سمجھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ احرار کا وفد کشمیر سے ناکام ہو کر واپس آ گیا۔۔۔۔۔۔ اس ناکامی کا مثبت پہلو یہ ہے کہ اب تحریک کا دائرہ وسیع کر دیا گیا اور اسے عوام میں پھیلا دیا گیا۔ چودھری افضل حق نے لکھا ہے کہ

(سرینگر سے) "واپس آ کر پرامن جنگ کو ہم نے ضروری سمجھ لیا تھا۔ دلائل بغیر قوت کے بیکار ہیں، کمزور کی دلیل بے دھار کا کھانڈا ہے، نہ اپنے ہاتھ کی زینت، نہ دوسرے کے گلے کی کاٹ۔ ہم نے قوت کی فراہمی پر زیادہ زور دیا۔ اب ریاست کو پہلے سے قومی تر خطرہ ہو گیا۔ شیخ محمد عبداللہ کو رہا کر دیا گیا۔ گورنمنٹ آف انڈیا اور ریاستی حکومت نے ہمارے ساتھ معاملہ کرنے کی لائن تیار کر لی۔ ہمیں کشمیر دوبارہ آنے کی دعوت دی گئی۔ ہم پھر وہاں گئے۔ ہم ریاست میں ذمہ دار حکومت کے طالب تھے۔ شیخ عبداللہ کے ذہن میں یہ ڈالا گیا تھا کہ اول تو احرار انگریزی حکومت کی مخالف جماعت ہے۔ گورنمنٹ آف انڈیا میں ان کا اثر معکوس ہے۔ دوسرے ان کا مطالبہ انقلابی نوعیت رکھتا ہے۔ مناسب ہے کہ تم ریاستی لیڈر کی حیثیت میں اقل ترین مطالبہ کرو اور احرار سے بے نیاز ہو جاؤ۔ بد نصیبی سے احرار کے خلاف یہ ہتھیار بڑا موثر ثابت ہوا۔ شیخ محمد عبداللہ کو ہم اپنا ہم خیال نہ بنا سکے۔ ہمارے پاس سوائے اس کے کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ ہم بھی ریاست میں سے ذمہ دار حکومت کا کوئی طالب بنائیں۔ گورنمنٹ آف انڈیا اور ہم دونوں یہ سمجھ رہے تھے کہ ہم آئندہ بیس برس کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ اور لڑائی اس بات کی ہے کہ "عوام کو کس قدر اختیارات دیئے جائیں۔"

("تاریخ احرار"۔ مولفہ: چودھری افضل حق)

سول نافرمانی

انگریزی حکومت کی ہمدردی سو فیصد ریاستی حکومت کے ساتھ تھی۔ وہ احرار کو انگریز دشمن جماعت تصور کرتے تھے جس کا اثر ورسوخ عوام میں زیادہ تھا۔ اس لئے اس جماعت کی سرکوبی ضروری تھی۔ اس کے ہر اقدام کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ وزیر اعظم اور مہاراجہ کشمیر کے ساتھ بات چیت ناکام ہو گئی تو احرار وفد ریاست چھوڑ کر واپس آ گیا اور سیالکوٹ پہنچتے ہی سول نافرمانی کا فیصلہ کر لیا گیا۔ والنٹیروں کو ریاستی حدود میں داخل ہونے کا حکم دے دیا گیا۔ مولانا مظہر علی اظہر اکیس نوجوان رضاکاروں کا پہلا دستہ لے کر خود آگے بڑھے اور ریاست کی سرحد پر گرفتار کر لئے گئے۔ ان کی گرفتاری در حقیقت آگے قدم بڑھانے کا اعلامیہ تھا۔ رضاکاروں کا شوق شہادت ابل پڑا اور اب پنجاب کے ہر ضلع سے نوجوان لپک پڑے۔ انگریزی حکومت کا اندازہ تھا کہ احرار رضاکاروں کی تعداد ۵ ہزار سے تجاوز نہ کرے گی۔ لیکن تحریک کے ابتدائی پانچ دنوں میں دس ہزار مسلمان رضاکار کشمیر کی سرحد پار کر کے گرفتاری پیش کر چکے تھے۔ (سرگودھا سے جو جیش کشمیر روانہ ہوا، اس میں راقم کے چچا مولوی کرم دین (مرحوم) بھی شامل تھے۔ انہوں نے اس تحریک میں چھ ماہ کی قید کاٹی) سول نافرمانی کا طریق یہ تھا کہ ۲۱ نوجوانوں پر مشتمل جتھے رات کی تاریکی میں سیالکوٹ سے روانہ ہوتے اور دشوار گزار پہاڑی راستوں سے ہو کر صبحدم جموں میں داخل ہو

جاتے۔ شہر کے در و دیوار تکبیر کے نعروں سے گونج اٹھتے۔ ہندو عوام تھرا جاتے۔ یوں لگتا جیسے محمود کی فوج نے پھر سومنات پر حملہ کر دیا ہے۔ ریاست کے ہندوؤں کو جان کے لالے پڑ گئے۔ ہر طرف ہاہا کار مچی ہوئی تھی کہ یہ مسلمان ملیچھ کہاں سے آ پہنچے ہیں۔ لیکن مسلمانوں کے لئے جیل جنت میں داخل ہونے کا راستہ بن گئی تھی۔ سیالکوٹ کے محاذ کے بعد ایک اور محاذ جہلم کے راستے میر پور کے مقام پر کھل گیا۔ بہت سے سرفروش راولپنڈی کے راستے کوہالہ پل کو عبور کر کے کشمیر میں داخل ہونے لگے۔ پل پر فوج بٹھا دی گئی تو نوجوانوں نے جہلم کی لہروں کو تیر کر عبور کرنا شروع کر دیا۔ کئی نوجوان لہروں کی نذر ہو گئے۔ حالات ریاستی حکومت کے قابو سے باہر ہو گئے تو مہاراجہ ہری سنگھ نے کشمیر کو وائسرائے کے حوالے کر دیا۔

مہاراجہ کی یہ تدبیر کارگر ثابت ہوئی۔ وائسرائے نے مزاحمت کو ہوا دینے کے بجائے مفاوت کمترین کی راہ اختیار کی اور سرکاری گزٹ میں احرار کی قوت کا اعلانیہ اعتراف کر لیا۔ سرکار پرست مسلمانوں نے احرار سے مطالبہ شروع کر دیا کہ ایجی ٹیشن ختم کر دی جائے۔ وائسرائے کے اعلان کا اثر کمزور طبیعت کے لوگوں نے بھی خاطر خواہ لیا لیکن احرار تو سر دھڑ کی بازی لگا چکے تھے۔ چنانچہ اب گجرات اور گورداسپور کی سرحدوں سے رضاکاروں نے نئی یلغار شروع کر دی۔ جاں فروشی اور ایثار کی ایک مثال چودھری افضل حق نے "تاریخ احرار" میں یوں پیش کی ہے:

"لکھنؤ کے مشہور احرار میاں منے خان گورداسپور کے قافلہ سالار تھے۔ علاقہ ہندوؤں کا تھا۔ وہاں ہندو آبادی نے ان کو گھیر لیا اور ڈوگروں نے سب کو جوتوں سے پیٹنا شروع کر دیا۔ جب والنٹیر بے ہوش ہو گئے تو ان کو انگریزی علاقے میں پھینک کر چلے گئے۔ منے خان پھر اٹھ کر ریاست میں داخل ہوئے۔ ساتھی ان کے ہمراہ تھے۔ اس دفعہ زیادہ زخم آئے۔ چنانچہ مرکزی دفتر نے اس سمت کی یلغار روک دی۔ دوسرے محاذوں پر گرفتاریاں دن دگنی رات چوگنی ہوتی گئیں۔"

ایک اندازے کے مطابق تین ماہ کے عرصے میں ۴۵ ہزار مسلمانوں نے گرفتاری پیش کی۔ ریاست کی جیلوں میں جگہ نہ رہی تو قیدیوں کو پنجاب کی جیلوں میں بھرنا شروع کر دیا گیا اور وہاں بھی گنجائش نہ رہی تو پولیس قیدیوں کو پکڑتی اور دفتر احرار میں چھوڑ جاتی کہ صبح کے وقت لے جائیں گے۔

انگریزی حکومت گفت و شنید پر آمادہ ہو گئی

اس طویل جدوجہد کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزی حکومت پنجاب گورنمنٹ کے ذریعے مجلس احرار کے ساتھ بات چیت پر آمادہ ہو گئی۔ مصالحت کی کچھ کوشش جمعیت العلما کے ایک وفد کے ذریعے بھی ہوئی جس میں مفتی کفایت اللہ اور مولانا احمد سعید شامل تھے لیکن بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔ احرار کشمیر میں پنجاب جیسے آئین کے نفاذ کا مطالبہ کر رہے تھے جسے حکومت انگلشیہ اور ڈوگرہ شاہی تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں تھی۔ جب سمجھوتہ عمل میں نہ آ سکا تو مہاراجہ کشمیر نے گلینسی کمیشن مقرر کر دیا تاکہ آئینی اصلاحات عمل میں لائی جا سکیں اور تحریک کا زور ٹوٹ جائے۔ لیکن مجلس احرار نے گلینسی کمیشن سے بھی عدم تعاون کا فیصلہ کیا۔ انہیں یقین تھا کہ کمیشن ان کے مطالبات کو تسلیم کرنے کے بجائے بات چیت کو طول دے گا، اپنے مطالبات منوانے اور احرار کو الجھانے کی کوشش کرے گا۔ گلینسی

کمیشن نے حکومت ہند اور مجلس احرار کے نظریات کے درمیان کا راستہ اختیار کیا لیکن احرار نے کشمیریوں کے لئے پنجاب جیسے حقوق حاصل کرنے کا جو وعدہ کیا تھا، وہ اس پر قائم رہے اور اپنے فیصلے سے کم پر آمادہ نہ ہوئے۔

کشمیر تحریک کا انجام

تحریک کشمیر ولولہ انگیز صورت میں چل رہی تھی کہ رمضان کا مہینہ آگیا۔ اچانک مسلمانوں کا سارا جوش و جذبہ کمزور پڑ گیا۔ عبادت کے مقابلے میں قومی جدوجہد کا جذبہ باقی نہ رہا۔ چودھری افضل حق نے لکھا ہے کہ

"ساری اسلامی قوم میدان محاربہ سے ہٹ کر مسجد ہو گئی، کسی زبان پر کشمیر کا نام نہ تھا۔ مسلمان جس جذبہ کو لے کر اٹھے تھے وہ سب بھول گیا۔ حالانکہ قرون اولیٰ میں اکثر ایسے صحابہ گزرے ہیں جو مصروف جہاد رہنے کی وجہ سے اکثر رمضان کے روزے نہ رکھ سکے تھے۔"

تحریک کا جوش و جذبہ ایک دفعہ سرد پڑ گیا تو پھر دوبارہ اسے متحرک کرنا ممکن نہ رہا۔ چنانچہ کشمیر کی یہ باعظمت تحریک بقول افضل حق "رمضان شریف کی نذر ہو گئی"۔۔۔۔۔

تحریک کے ثمرات

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ

:: کیا مسلمان رضاکاروں اور مجلس احرار کی قربانیاں رائیگاں گئیں؟

:: کیا تحریک کشمیر ناکام ہو گئی؟

حالات کا منصفانہ جائزہ لیا جائے تو اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ ۱۳ نومبر ۱۹۳۱ء کو گلینسی کمیشن کا قیام اس تحریک ہی کا نتیجہ تھا۔ گلینسی کمیشن نے جن بڑی بھلی اصلاحات کی نفاذ کی سفارش کی وہ بھی اس تحریک ہی کے ثمرات ہیں۔ اس تحریک نے کشمیری عوام میں بیداری کی لہر پیدا کی۔ "پنجاب کی سیاسی تحریکیں" کے مصنف عبداللہ ملک کا یہ تجزیہ درست ہے کہ:

"برصغیر کی ریاستوں میں جو عوامی تحریکیں منظم ہوئیں، ان میں اگر سب سے زیادہ جاندار عوامی تحریک کہیں منظم ہوئی تو وہ یہی کشمیر کی ریاست تھی اور آج بھی کشمیر کے اندر جو جہاد ہو رہا ہے۔ اس کے ڈانڈے ۱۹۲۷ء میں شروع ہونے والی حقوق طلبی کی تحریک ہی سے جا ملتے ہیں۔"

تحریک کشمیر نے درمیانے طبقے کے نوجوانوں کو سیاسی شعور عطا کیا۔ ان میں ایثار اور قربانی کا جذبہ پیدا کیا۔ اس تحریک سے چودھری غلام عباس، میر واعظ احمد اللہ ہمدانی، میر واعظ یوسف شاہ، شیخ محمد عبداللہ، سردار گوہر رحمٰن جیسے رہنما سامنے آئے اور مسلم کانفرنس اور بعد میں نیشنل کانفرنس کے قیام کے لئے راہ ہموار ہوئی۔

گلینسی کمیشن نے ۲۲ مارچ ۱۹۳۲ء کو اپنی رپورٹ مہاراجہ کشمیر کو پیش کی۔ اس پر ۱۰ اپریل ۱۹۳۲ء کو احکامات جاری کئے گئے۔ مہاراجہ نے کمیشن کی سفارشات کو منظور کرتے ہوئے ان پر حتی الامکان جلد سے جلد عمل کرنے کی ہدایت کی۔ ان سفارشات پر احکامات کا اجمال حسب ذیل ہے:

۱۔ مذہبی توہین ممنوع قرار دی گئی۔ تبدیلی مذہب پر خوفزدہ کرنے اور اذان سے روکنے والوں کو قابل مواخذہ شمار کیا گیا۔

۲۔ عبادت گاہیں بنانے کی اجازت دی گئی۔ مقدس مقامات جو پہلے ریاست کی تحویل میں تھے، مسلمانوں کو واپس کر دیئے گئے۔ مختلف زیارات کا نظم و نسق مسلمانوں کو سونپ دیا گیا۔

۳۔ تعلیمی کمیشن کی سفارشات کے مطابق ابتدائی تعلیم کی توسیع اور عربی کے مصلموں کی تعداد میں اضافہ کیا گیا۔ صنعتی تعلیم کے اجراء کے متعلق احکامات دیئے گئے۔ حکم دیا گیا کہ سائنس کی تعلیم میں فرقہ وارانہ جانبداری سے کام نہ لیا جائے۔ مسلمان اساتذہ اور انسپکٹروں کی تعیناتی کرنے کی اجازت دی گئی۔

۴۔ ملازمتوں کے لئے مختلف اقوام کی آبادی کے تناسب کو ملحوظ رکھنے کے احکام جاری کئے گئے۔

۵۔ مالیہ اراضی کی مالکانہ وصولی بند کر دی گئی۔ کوا پریٹو قرضوں کے نظام کو وسعت دی گئی۔ ذبح کیئے جانے والے جانوروں کو حدود شہر میں لانے پر جو محصول عائد تھا، وہ ختم کر دیا گیا۔ اخروٹ کی لکڑی کاٹنے پر جو پابندی تھی، وہ ہٹادی گئی۔

۶۔ پریس ایکٹ کو برطانوی ہند کے مطابع کے قوانین کے مطابق کرنے کا حکم دیا گیا۔

کشمیری عوام کے حقوق کے حصول کے لئے " تحریک کشمیر" کو خارجی طور پر ڈوگرہ شاہی اور انگریزی حکومت کا سامنا تھا تو داخلی طور پر انگریزوں کے وفادار مسلمانوں کا سرکار پرست اعلیٰ طبقہ بھی اس کے حق میں کچھ زیادہ سرگرم نہیں تھا۔ اس تحریک کے خلاف ایک محاذ قادیانی فرقے نے بھی کھول رکھا تھا جسے احرار رہنماؤں نے تحریک کے ابتدائی دنوں میں پسپائی اختیار کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس فرقے کے لوگوں نے کشمیر تحریک کے پردے میں کشمیر میں اچھے خاصے پاؤں جمالیئے تھے۔ لیکن احرار نے یہ اثرات پورے جوش و جذبے سے کم کرنے کی کوشش کی۔

ان نامساعد حالات کو پیش نظر رکھیں تو تحریک کشمیر کے ثمرات اگرچہ زیادہ تر بالواسطہ ہیں۔ لیکن یہ بے حد اہم اور گراں قدر نظر آتے ہیں۔

کتابیات

۱۔ پنجاب کی سیاسی تحریکیں از عبداللہ ملک

۲۔ میرا افسانہ از چودھری افضل حق

۳۔ تاریخ احرار از چودھری افضل حق

۴۔ حیات امیر شریعت از جاں باز میرزا

۵۔ مائی فروزن ٹربولینس۔
(MY FRO ENTURBULANCE) از جگ موہن